پر غالب ہوتے ہیں۔ معروضیت قلب کو غضب و شہوت سے پاک کر کے اسے تقوی و زہد کا مسکن بنا کر حاصل ہوتی ہے، عقلیت دماغی کے فروغ سے حاصل نہیں ہوتی۔ جس کا حال اور مقام جس قدر بلند ہوگا، اس کا مشاہدہ بھی اسی قدر معروضی ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ امت میں کسی عالم و مجتہد کے محض علم کی بنیاد پر اس کے افکار کو قبولیت حاصل نہیں ہو جاتی بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اس کے حال کو بھی دیکھا جاتا ہے۔ جس کا حال درست نہ ہو، اس کا علم (مشاہدہ) بھی لائق اعتبار نہیں سمجھا جاتا۔

پس نیت، حال، مقام اور مشاہدہ تعمیر نفس و اصلاح نفس کے بنیادی عناصر ہیں۔ "اصلاح نفس" فی الحقیقت "تعیین نفس" کا ہی عنوان ہے۔ پس جس قدر ہم نفوس کی اصلاح کر پائیں گے، اسی قدر ہم انہیں کلام الٰہی سے اکتساب فیض کے لائق بنا پائیں گے۔ یہ امید رکھنا کہ نفس کی چاہت تو آزادی ہی ہو مگر وہ کلام الٰہی سے اکتساب کے لائق بھی ہو، یہ ممکن نہیں۔ کہنے کا مطلب یہ کہ نفس سے متعلق مغربی مفروضات و افکار کے اندر رہتے ہوئے یہ ممکن نہیں کہ نفس کو کلام الٰہی کا مخاطب بنا کر اس کی طرف راغب کیا جا سکے۔ ایسا نفس کلام الٰہی میں نہیں، صرف خواہشات کی تسکین میں معنویت تلاش کرتا ہے۔

پس معلوم ہوا کہ لسانیاتی مباحث کے تناظر میں الہامی کتب کو بے معنی ثابت کرنے کی فکر نفس انسانی سے متعلق اس وجودیاتی مفروضے پر مبنی ہیں کہ نفس انسانی نہ تو کچھ ہے اور نہ ہی خود کو جان سکتا ہے، یہ مسلسل ہوتا رہتا ہے۔ اس فلسفیانہ مفروضے کی نہ تو کوئی قطعی منصوص دلیل ہے اور نہ ہی کوئی عقلی، اس کے حق میں زیادہ سے زیادہ چند استقرائی نظائر پیش کیے جا سکتے ہیں۔ اس دنیا میں اربوں انسان نہ صرف یہ کہ ہر روز اپنے ہم عصر لوگوں سے ہم کلام "ہوتے ہیں" بلکہ ماضی کے لوگوں کے کلام اور افکار کو بھی ٹھیک ٹھیک "سمجھ لیتے ہیں"، اتنا ہی نہیں بلکہ اپنے اور انکے افکار کا ٹھیک ٹھیک موازنہ بھی کر لیتے ہیں، یہ نہایت سادہ سی حقیقت اپنے اندر اشتراک نفس سے متعلق بہت سے معانی سمیٹے ہوئے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو احسن تقویم پر پیدا کیا نہ کہ nothingness پر، انسانیت کا آغاز جہالت سے نہیں بلکہ ایسی برگزیدہ شخصیت سے ہوا جسے اللہ تعالیٰ نے اسماء اور معانی کا علم سکھایا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہائیڈیگر کا وجودیاتی مفروضہ ایسے انسان پر غور و فکر کا نتیجہ ہے جس کا رابطہ اپنے رب سے کٹ چکا ہے، وہ کسی نامعلوم وجہ سے دنیا میں پھینک دیے جانے (Throwness) کی کیفیت کا شکار ہو کر اضطرار سے دوچار ہے۔ ایسا نفس مضطر راصلاح کا موضوع ہے نہ کہ معانی کے تعین میں پیمانہ بن جانے کا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں سمجھنے اور عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

ڈاکٹر محمد غطریف شہباز ندوی

دیوبند کا ایک علمی سفر

دارالعلوم دیوبند ہندوستان کے مسلمانوں کا دھڑکتا ہوا دل ہے۔ وہ از ہر ہند کے نام سے بھی موسوم کیا جاتا ہے۔ راقم السطور نے اس سے قبل بھی تین مرتبہ دیوبند کا سفر کیا ہے۔ سب سے پہلا سفر زمانہ طالب علمی میں آج سے کوئی 20 سال پہلے کیا تھا جس کی کوئی خاص بات یاد نہیں۔ بس اتنا یاد ہے کہ بعض دوستوں کے ساتھ مولانا سعید احمد پالن پوری کے درس ترمذی میں شرکت کی تھی جس کا ان دنوں شہرہ تھا۔ ایک سفر کسی استفتاء کی خاطر، اور ایک بعض کتابوں کی خریداری کے لیے ہوا تھا کیونکہ دیوبند ہندوستان میں اردو وعربی میں علمی کتابوں کی سب سے بڑی اور سستی مارکیٹ بھی ہے۔ بہر حال میرے اِس سفر کی غرض وغایت مسلم یونیورسٹی کے فارغین مدارس کے لیے شروع کیے گئے برج کورس (Bridge Course) کے سلسلہ میں دیوبند کے علماء، اساتذہ ومشاہیر کے تاثرات وخیالات سے آگاہی حاصل کرنی تھی۔

یاد رہے کہ مذکورہ برج کورس میں فارغین مدراس کو ایک سال عصری علوم: سیاسیات، سائنس، جغرافیہ، تاریخ، سماجیات، معاشیات، انگریزی زبان وادب اور انٹرفیتھ وانٹرافیتھ ڈائلاگ (بین المذاہب اور بین المسالک مفاہمت) وغیرہ پڑھائے جاتے ہیں۔ اس کے بعد یونیورسٹی اِن طلبہ کو Senior Secondry کا سرٹیفکیٹ دیتی ہے اور وہ یونیورسٹی کی Main Stream میں Arts side کے کسی بھی شعبہ میں B.A کرنے کے مجاز ہوجاتے ہیں۔ فی الحال اس کورس کا تیسرا بیچ کامیابی کے ساتھ چل رہا ہے۔ اس کورس کا عموماً استقبال کیا گیا۔ بڑی تعداد میں دیوبندی، بریلوی، اہل حدیث اور جماعت اسلامی کے اداروں سے طلبہ یہاں آئے اور اب وہ ملک کی ممتاز یونیورسٹیوں جامعہ ملیہ اسلامیہ، جامعہ ہمدرد جے این یو اور خود مسلم نیورسٹی علی گڑھ میں مختلف مضامین میں اعلیٰ تعلیمی مراحل طے کر رہے ہیں۔ تاہم مسلمانوں کا عمومی مزاج منفی ہے۔ عصری آگہی اور منفی کو مثبت میں بدلنے کا فن ان کو نہیں آتا جس کی وجہ سے عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ شروع میں ہر نئی آواز پر لبیک کہتے اور ہر نئی تحریک کی طرف لپکتے ہیں، پھر جلد ہی شکوے وشکایت شروع ہوجاتے ہیں۔ اخبارات ورسائل میں منفی وریکیک تبصرے کیے جاتے ہیں اور پھر وہ چیز سرد مہری کا شکار ہوجاتی ہے۔ گویا ؎

چلتا ہوں تھوڑی دیر ہر اک راہرو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

* ڈائرکٹر فاؤنڈیشن فار اسلامک اسٹڈیز نئی دہلی۔ mohammad.ghitreef@gmail.com

والا معاملہ ہے۔ ایسا ہی کچھ ان دنوں برج کورس کے ساتھ ہو رہا ہے۔ بعض منفی ذہن کے عناصر کا ''دین وایمان'' صرف اس لیے خطرہ میں پڑ گیا ہے کہ برج کورس کے نظریہ ساز محرک اور علمی اور عملی ڈائریکٹر پروفیسر راشد شاز ہیں۔ ڈاکٹر راشد شاز کے قرآن، سنت فقہ وتصوف اور اسلامی فکر کے سلسلہ میں اپنے خیالات ہیں، ان کی اپنی تحقیق ہے جو انہوں نے وسیع مطالعہ کی بنیاد پر قائم کی ہے۔ کسی کو ان کے خیالات، فکر اور ان کے دلائل سے اختلاف ہوسکتا ہے اور اختلاف کیا جانا چاہیے، مگر اس اختلاف کو علمی اختلاف کی ہی حد تک رکھا جانا اور برج کورس کو پروفیسر شاز کی شخصیت وفکر سے الگ کر کے دیکھا جانا چاہیے تھا، مگر ایسا نہیں ہوا۔ یونیورسٹی کے اندر و باہر بڑے پیمانے پر اس کے خلاف فضا بنائی گئی۔ علی گڑھ ہی کے ایک صاحب اب مختلف مدارس ومراکز افتاء سے شاز صاحب کے خلاف تکفیر کی مہم چلا رہے ہیں، بعض اکابر ومحترم شخصیات کا کھلا تعاون بھی ان کو حاصل ہے۔ فالی اللہ المشتکی۔

بہر حال ۲۹ مارچ کو راقم نئی دہلی سے بذریعہ جالندھر امرتسر ایکسپریس روانہ ہو کر دیوبند اترا۔ مولانا صدرِ عالم قاسمی صاحب کو فون کر لیا تھا۔ دیوبند کے مہمان خانے میں دو گھنٹہ رکا رہا۔ یاد رہے دار العلوم دیوبند کا مہمان خانہ بہت کشادہ ہے اور ہر روز پچاسوں مہمان یہاں آتے ہیں، پورے ملک کے مدارس میں یہ اس کی بڑی خصوصیت ہے۔ اس کے بعد مولانا صدر عالم قاسمی آ گئے اور باصرار مجھ کو اپنی قیام گاہ پر لے گئے۔ ان کو میرے بارے میں رفیق محترم ڈاکٹر وارث مظہری نے ازراہ کرم فون کر کے اطلاع دے دی تھی۔ اس کے بعد سے تین دن تک انہیں کی میزبانی سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ مولانا صدر عالم بہترین علمی ذوق رکھتے ہیں۔ ان کی دو روم والی قیام گاہ کتابوں سے بھری تھی جس میں علوم اسلامیہ کے مصادر ومراجع کی کثرت تھی۔

دوسرے دن علی الصباح ناشتہ کے بعد اساتذہ سے ملاقات کے لیے نکلے۔ دفتر اہتمام میں مولانا محمد شاہد قاسمی نگراں دار الاقامہ دیوبند نے پہلے برج کورس کے بارے میں تفصیلی معلومات حاصل کیں۔ ان کا کہنا تھا کہ برج کورس فی نفسہ طلبہ کے لیے بہت مفید ہے، لیکن ڈاکٹر راشد شاز صاحب کے بارے میں جو معلومات ہیں، اس کے لحاظ سے وہ کوئی صحیح عقیدہ کے آدمی نہیں معلوم ہوتے۔ دوسری بات یہ ہے کہ جس طرح مولانا آزاد قومی اردو یونیورسٹی نے اپنے ریجنل سنٹرز کھول رکھے ہیں اور دیوبند میں بھی ان کا ایک سینٹر ہے۔ اسی طرح برج کورس بھی اپنا ایک مقامی سینٹر یہاں کھول دے۔ اسی طرح جامعۃ الشیخ کے ایک استاد مولانا عباداللہ نے رائے دی کہ دیوبند میں مناسب مقامات پر برج کورس کے اعلانات آویزاں کیے جائیں تاکہ طلبہ کو زیادہ سے زیادہ معلومات مل سکے۔ دار العلوم کے شعبہ کمپیوٹر وشعبہ نشر واشاعت میں پہنچے۔ جہاں اس شعبہ کے سربراہ جناب عبد السلام قاسمی صاحب سے تفصیلی بات چیت ہوئی، وہیں پر دار العلوم کے میڈیا انچارج جناب اشرف عثمانی دیوبندی بھی موجود تھے (جو راشٹریہ سہارا روزنامہ سے بھی وابستہ ہیں)۔ مؤخر الذکر نے پروفیسر شاز کی جم کر تنقید ومذمت کی اور صاف صاف کہہ دیا کہ جب تک ڈاکٹر شاز وہاں موجود ہیں، ہم اس کورس کی مخالفت جاری رکھیں گے۔ بہر حال ان کے ہاں سے نکل کر مدیر تعلیمات اور سینئر استاد حدیث مولانا عبد الخالق سنبھلی کے دفتر میں پہنچے۔ آپ نے سکون سے ہماری معروضات سنیں۔ اس کے بعد فرمایا کہ مسلم یونیورسٹی باضابطہ اپنے لیٹر پیڈ پر ہمیں اس کورس کے بارے میں لکھ کر دے، تبھی ہم اس کے بارے میں کچھ کہہ سکیں گے۔

مولانا کے پاس سے اٹھ کر دورہ کے ایک طالب علم کے ساتھ جو برج کورس کے بارے میں زیادہ دلچسپی لے رہے تھے، مولانا عبدالخالق مدراسی صاحب کے ہاں پہنچے جو نائب مہتمم ہیں اور سینئر استاد ہیں۔ یاد رہے کہ مہتمم دارالعلوم مولانا مفتی ابوالقاسم نعمانی بنارسی اس وقت ملک سے باہر عمرہ کے مبارک سفر پر گئے ہوئے تھے۔ مولانا عبدالخالق نے ہماری باتیں اطمینان سے سنیں اور دیر تک پر لطف گفتگو فرمائی۔ ان کے جوابات کا خلاصہ یہ تھا کہ ڈاکٹر راشد شاز یا برج کورس کے بارے میں ہماری معلومات براہ راست نہیں، اخباری رپورٹوں اور سنی سنائی باتوں پر مشتمل ہیں۔ ہمارے اساتذہ ان کے بارے میں کوئی اچھی رائے نہیں رکھتے۔ جو باتیں اب تک معلوم ہوئی ہیں، وہ بڑی تشویش ناک ہیں۔ ان کو ہیڈ آف دی ڈپارٹمنٹ تو نہیں بنانا چاہیے تھا۔ جہاں تک فی نفسہ کورس کی بات ہے، ہم نہ اس کی مخالفت کرتے ہیں نہ طلبہ کو وہاں جانے سے روکتے ہیں، لیکن اس کی حوصلہ افزائی بھی نہیں کرتے، کیونکہ ہمارے مقاصد بالکل الگ ہیں۔ ہمارا احساس ہے کہ جو طلبہ کالج و یونیورسٹیوں میں گئے ہیں، انہوں نے مجموعی طور پر ملت کو کچھ خاص نہیں دیا ہے۔ یونیورسٹی میں جا کر آدمی اپنی ذات میں گم ہو جاتا ہے۔ وہاں Competition اس طرح کا ہے کہ آدمی خدمت دین وملت کا جذبہ رکھتے ہوئے بھی کچھ نہیں کر پاتا اور ختم ہو کر رہ جاتا ہے۔ ہم نے عرض کیا کیا کہ دارالعلوم نے شعبہ انگریزی کھولا ہے۔ یہ بہت خوش آئند قدم ہے، مگر اس میں تخصص کے صرف 20 طلبہ لیے جاتے ہیں (جو مجموعی نمبرات میں 70 فیصد حاصل کر لیتے ہوں)۔ بقیہ عام طلبہ کو کیوں انگریزی سے محروم رکھا جا رہا ہے؟ اس کے جواب میں مولانا نے جو منطق پیش کی، وہ بہت عجیب تھی۔ انہوں نے کہا کہ جنوبی ہند میں انگریزی عام بول چال کی زبان ہے۔ وہ دوسرے فرقوں کے لوگ جلسوں میں انگریزی میں تقریر کر کے لوگوں کے ذہن بگاڑتے ہیں، اس لیے جنوب کے لوگوں نے ہم سے کہا کہ آپ ہمیں ایسے قاسمی طلبہ دیجیے جو انگریزی میں تقریر کر سکیں، اس لیے ہم نے اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے محدود پیمانہ پر یہ شعبہ شروع کیا ہے۔

یہاں بر سبیل تذکرہ یہ بتانا بے محل نہ ہوگا کہ دہلی میں جامعہ ملیہ اسلامیہ اور دہلی یونیورسٹی میں گئے اس شعبہ کے چند استادوں کو ہم نے دیکھا ہے جن کی انگریزی تو بہت اچھی ہے، لیکن ان کو عصری آگہی بالکل حاصل نہیں ہوئی۔ اس لیے صرف انگریزی سیکھ لینا یا سکھا دینا مسئلہ کا حل نہیں ہے جیسا کہ بدقسمتی سے دارالعلوم دیوبند کے اربابِ حل وعقد سمجھتے ہیں اور اس سے زمانہ کی وہ معرفت حاصل نہیں ہو جاتی جس کو امام محمد نے یوں کہا تھا کہ 'من لم یعرف اھل زمانہ فھو جاھل'۔ (جس کو زمانہ کی معرفت حاصل نہیں، وہ عالم کہلانے کا حقدار نہیں)۔

بہر حال ان کے پاس سے نکل کر ہم لوگ دارالعلوم کی کتابوں کی مارکیٹ دیکھنے نکل گئے۔ اس مارکیٹ کی خصوصیت یہ ہے کہ یہاں بہت سستی کتابیں مل جاتی ہیں۔ جو کتاب آپ کو دہلی یا کسی دوسرے شہر میں پانچ سو میں ملے گی، وہ دیوبند میں صرف ایک سو میں مل جائے گی۔ دوسری چیز یہ ہے کہ دیوبند کی کتاب مارکیٹ میں عربی اردو کتابوں پر مرتکز ہے جو زیادہ تر درس کتب کی شروح، حواشی، حواشی کے حواشی اور ان کتابوں کے ترجموں وکلیدوں پر مبنی ہے۔ درس نظامی ہو یا ندوہ کا نصاب، مارکیٹ کے استادانِ فن نے ان کی کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ بابڑی سی بڑی کتاب بھی بغیر ترجمہ کے نہیں چھوڑی ہے۔ اونچی کتابوں کی تو چھوڑیئے منہاج العربیہ اور القراءۃ الواضحہ جیسی ابتدائی کتابوں کے

ترجمے بھی بکثرت اور بآسانی دستیاب ہیں۔ یہاں تقریروں اور خطابات کی کتابیں بھی بکثرت ملتی ہیں۔اسی طرح ملفوظات ومواعظ کی بھی۔ البتہ ایک اچھی بات یہ ہوئی ہے کہ عالم عرب کے مشہور مکتبات (قاہرہ، بیروت، دمشق اور سعودی عرب قطر وکویت) کی عربی واسلامی علوم: علوم القرآن، علوم الحدیث، تفسیر، ادب، شروحات وغیرہ اب سب دیوبند کے بڑے کتب خانوں میں بھی دستیاب ہیں۔ بیرون ہند سے اگر آپ کو تہذیب التہذیب کا سیٹ پچیس ہزار ہندی روپے میں حاصل ہوگا تو دیوبند وسہارنپور کے مکتبات میں اُسے آپ نو یا دس ہزار روپے میں حاصل کر سکتے ہیں۔ اس چیز سے اہل علم کو بڑی سہولت فراہم ہوگئی ہے۔

آج کل دیوبند انگریزی عربی بول چال، انگریزی عربی ڈکشنریوں اور ترجمہ وانشاء سکھانے والی کتابوں کا بھی بڑا زور ہے۔ پہلے دارالعلوم میں جدید عربی پر توجہ نہیں تھی مگر استاذ مولانا وحید الزماں کیرانوی مرحوم عربی زبان کے عاشق صادق تھے۔ انہوں نے بڑی جدوجہد ومحنت سے ایسے تلامذہ پیدا کر دیے تھے جو آج اس ذوق کو طلبہ میں جلا دے رہے ہیں جس طرح کہ علامہ انور شاہ کشمیری کے تلامذہ کا ایک مخصوص علمی ذوق ہوا کرتا تھا اور ان میں سے ہر شخص اپنی جگہ مرجع ہوتا تھا، مثلاً علامہ یوسف بنوری، مولانا سعید احمد اکبرآبادی، مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی وغیرہم۔ ایک چیز یہ بھی مشاہدہ میں آئی کہ دیوبند میں جگہ جگہ انگریزی وکمپیوٹر سکھانے والے سنٹر اور کوچنگ مراکز کھل گئے ہیں جن میں طلبہ اپنے شوق سے یہ چیزیں سیکھ رہے ہیں۔

کتاب لاتحزن: شخصیت کے ارتقاء پر انگریزی میں ڈیل کارنیگی بہت مشہور مصنف ہے۔ اردو عربی میں اس موضوع پر کوئی خاص کتاب نہ تھی۔ تقریباً ایک دہائی قبل سعودی عرب کے مشہور مصنف شیخ عائض القرنی نے **لاتحزن** کے نام سے ایک کتاب لکھی جو عالم عرب کی اس وقت مقبول ترین کتاب ہے۔ کوئی بک اسٹور اور کتب خانہ اس سے خالی نہیں یہ کتاب ملینوں میں چھپتی اور بکتی ہے۔ اردو میں راقم نے اس کا ترجمہ ''غم نہ کریں'' کے نام سے کئی سال پہلے کیا تھا جو ریاض کے مشہور ناشر الدار العالمی للکتاب الاسلامی نے کرایا تھا۔ کتاب قرآن وحدیث، اقوال سلف، شخصی تجربات وامکاناتِ زندگی کا نچوڑ ہے۔ اصل کتاب کے ساتھ اس کے اردو ترجمہ کو بھی حیرت انگیز مقبولیت ملی ہے۔ حیدرآباد (انڈیا) کے کثیر الاشاعت روزنامہ منصف نے اس کے اردو ترجمہ کو تقریباً ڈیڑھ سال تک بالاقساط مکمل شائع کیا۔ اس کے علاوہ اصل ناشر (الدار العالمی ریاض) کے علاوہ پاکستان میں لاہور کے مکتبہ قاسم العلوم نے اور دہلی کے ناشروں کے علاوہ دیوبند کے مکتبہ یوسفیہ نے شائع کر رکھی ہے۔ طلبہ وعوام بھی اس پر ٹوٹے پڑتے ہیں۔ بہت سے طلبہ و اساتذہ نے راقم کا غطریف شہباز سنتے ہی کہا: **لاتحزن** کے مترجم؟ یوں حیرت انگیز طور پر دور دور تک یہ ترجمہ خاکسار کے تعارف کا ذریعہ بن گیا ہے، حالانکہ مترجم نے خود اس کتاب کو بہت زیادہ اہمیت نہیں دی تھی کیونکہ اس کا اصل ذوق علمی، فکری اور تحقیقی کتابیں پڑھنے کا ہے۔

دیوبند کے ایک معروف مصنف اس وقت مولانا ندیم الواجدی ہیں میں جو ایک بڑے کتب خانہ کے مالک، متعدد کتابوں کے مصنف اور ماہنامہ ترجمان دیوبند کے مدیر ہیں۔ اس کے علاوہ لڑکیوں کی دینی تعلیم کا ایک ادارہ دارالعلوم عائشہ صدیقہ للبنات بھی چلاتے ہیں۔ آپ کے صاحبزادہ مولانا یاسر ندیم دیوبندی نے دیوبند دارالعلوم سے فراغت

کے بعد انہوں نے انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی ملائیشیا اور پھر امریکہ کی ایک دانش گاہ سے بھی اکتساب فیض کیا ہے۔ مولانا ندیم الواجدی نے راقم کا نام سنتے ہی پہچان لیا اور بڑے تپاک سے ملے۔ ضروری تواضع کے بعد راقم نے ان سے برج کورس کی افادیت کے بارے میں ان کے تاثرات معلوم کیے مولانا ندیم الواجدی نے فرمایا: دینی مدارس کے فارغین کے لیے یہ کورس نہایت مفید ہے۔ اس کی افادیت میں کوئی شبہ نہیں، البتہ اس کے ڈائرکٹر پروفیسر راشد شاز کی شخصیت متنازعہ فیہ بن گئی ہے۔ یہی اصل مسئلہ ہے (حالانکہ میرے (واجدی کے) ان سے خوش گوار تعلقات ہیں)۔ اس کورس کا ذمہ دار متنازعہ نہیں ہونا چاہیے۔ ہم نے عرض کیا کہ جناب شاز صاحب اپنے فکر کو اس کورس سے بالکل الگ کر کے رکھتے ہیں۔ اس جواب سے وہ مطمئن ہوئے اور انہوں نے کہا کہ آئندہ بھی ایسا ہی ہونا چاہیے۔ برج کورس میں Science Stream کے آغاز اور پھر اس کو جاری نہ رکھ پانے کی مشکلات ہم نے ان کے گوش گزار کیں تو انہوں نے کہا کہ برج کورس کو مدارس سے اس مسئلہ میں کسی مدد کی توقع نہیں کرنی چاہیے۔ دارالعلوم نے جنرل سائنس کے نام سے (اردو میں) سائنس پڑھانے کا ایک تجربہ شروع کیا تھا جو جاری نہیں رہ سکا۔ اصل میں مولانا ارشد مدنی سابق مدیر تعلیمات دارالعلوم دیوبند وسینئر استاد حدیث اور جمعیۃ العلماء (ارشد گروپ) کے صدر اس چیز کے سخت خلاف ہیں اور جب تک وہ اس کے قائل نہ ہوں، یہاں کوئی بھی کچھ سننے کا روادار نہ ہوگا۔

اس کے بعد ہم نے مولانا شاہ عالم قاسمی گورکھپوری کے مکان کا قصد کیا۔ مولانا سے ملنے کے اشتیاق کی خاص وجہ یہ تھی کہ انہوں نے تفسیر قرآن کی ایک ویب سائٹ ڈیولپ کی ہے جس میں دیوبندی، بریلوی، اہل حدیث اور جماعت اسلامی سبھی مکاتب فکر کی تفسیریں اور قرآن سے متعلق اور خدمات جمع کر دی ہیں۔ یہ ایک مثبت، خوش آئند اور تعمیری کام ہے۔ برج کورس کے بارے میں ان کے تاثرات جاننے کے علاوہ راقم کے ذہن میں یہ بھی سوال تھا کہ مکتب فراہی کی تفسیری خدمات بھی ان کی ویب سائٹ کا حصہ بنیں گی یا نہیں۔ اگر نہیں تو اس کی وجوہات کیا ہیں؟ کہ برصغیر میں اس مکتب فکر کی خدمات کا ذکر کیے بغیر کوئی بھی فہرست/سائٹ ادھوری ہوگی۔ لیکن افسوس کہ مولانا سے ملاقات نہ ہو سکی کیونکہ وہ لمبے سفر پر گئے ہوئے تھے۔ اسی طرح مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی (استاد حدیث اور مدیر ماہنامہ ترجمان دارالعلوم (دارالعلوم کا سرکاری آرگن) سے ملاقات نہ ہو سکنے کا قلق بھی بھی رہا۔ موصوف بھی سفر پر گئے ہوئے تھے۔

مولانا پالن پوری کی خدمت میں: موجودہ وقت میں دارالعلوم دیوبند کی سب سے مشہور علمی شخصیت مولانا مفتی سعید احمد پالن پوری ہیں جو دارالعلوم کے شیخ الحدیث ہیں۔ وہ دارالعلوم میں گزشتہ 40 سالوں سے حدیث کا درس دے رہے ہیں۔ حجۃ اللہ البالغہ کی اردو شرح رحمۃ اللہ الواسعہ کے مؤلف ہیں جو علمی دنیا میں خاصی معروف ہے۔ اس کے علاوہ موصوف کے اور بھی فقہی وحدیثی کارنامے معروف ہیں۔ ان کے خادم خاص مولانا اشتیاق احمد قاسمی نے بتایا کہ مولانا کی کتابوں کی طلب غیر ممالک میں بہت زیادہ ہے۔ اس وقت دارالعلوم سے ان کی تنخواہ تیس ہزار روپے مقرر ہے، مگر وہ تنخواہ نہیں لیتے بلکہ اپنی کتابوں کی یافت پر گزر بسر کرتے ہیں۔ رضا کارانہ خدمات انجام دینا آج کی دنیا میں بہت بڑی بات ہے۔ مولانا اشتیاق عالم نے راقم کی عربی تحریریں البعث الاسلامی میں پڑھی ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ میں آپ سے بہت متاثر ہوں مگر اسی بے تکلفی میں انہوں نے میری ڈاڑھی کی خبر بھی لے لی۔

خیر، مولانا پالن پوری کی عام مجلس عصر تا مغرب روزانہ لگتی ہے جس میں کثرت سے استاد، زائرین اور طلبہ حاضر ہوتے ہیں۔ راقم بھی مولانا صدر عالم کے ساتھ آپ کی مجلس میں حاضر ہوا۔ سلام کے بعد جیسے ہی اندر داخل ہوئے، مولانا نے فوراً تاڑ لیا کہ باہر کا بندہ ہے۔ پوچھا، کہاں سے آئے ہو؟ میں نے عرض کیا، دہلی سے۔ پوچھا، کیا کرتے ہیں؟ میں بتایا کہ میرا ترجمہ وتالیف کا کام ہے اور صحافت سے بھی تعلق ہے۔ نیز بعض طلبہ کو انگریزی زبان اور عربی ادب بھی پڑھاتا ہوں۔ مولانا کی طبیعت میں ظرافت بھی ہے۔ اسی وقت کہیں باہر سے ایک تبلیغی جماعت مصافحہ کے لیے آئی جس میں سب سے پہلے آنے والے عالم بہت تن وتوش والے تھے۔ مفتی صاحب چھوٹتے ہی بولے، ''بہت موٹا مولوی ہے۔ اسی سے زیادہ گشت کرایا کرو۔'' پوری مجلس زعفران زار ہوگئی۔ میں نے جگہ بناتے بناتے مولانا سے قریب جا کر کہا، حضرت ایک اشکال ذہن میں ہے کہ درس نظامی پر علامہ بنوری اور مولانا گیلانی نے شدید تنقید کی ہے، مگر ہم اس میں کوئی تبدیلی نہیں لا رہے ہیں؟ کہنے لگے۔ ''میں بھی اس کا ناقد ہوں، مگر مولانا بنوری کی تنقید مجھے پسند نہیں آئی۔ انہوں نے کاغذ بچانے اور از حد اختصار سے کام لینے کا شکوہ کیا ہے حالانکہ جو اس درس کے مختصر متون ہیں، وہ ازبر یاد کرنے کے لیے ہیں''۔ ظاہر ہے یہ کہ اصل اشکال کا کوئی جواب نہیں تھا۔

میرے ہاتھ میں اس وقت کتاب ''تناقضات الالبانی الواضحات'' از حسن علی السقاف تھی۔ پوچھا، یہ کیا ہے؟ میرے ہاتھ سے کتاب لے کر دیکھی اور پھر تبصرہ کیا۔ ''یہ عرب اب لکیر پیٹ رہے ہیں۔ مولانا (محدث) حبیب الرحمٰن اعظمیؒ نے ابتدا میں تناقضات الالبانی لکھ کر عربوں کو توجہ دلائی تھی۔ البانی نے بڑا نقصان پہنچا دیا ہے۔ اب دو سو سال اس کی بھرپائی میں لگیں گے''۔ اسی وقت مغرب کی اذان ہوگئی اور یوں مجلس برخواست ہوگئی۔ ظاہر ہے کہ مولانا کا البانیؒ صاحب پر سخت تبصرہ اور ان کی زبان مولانا کی شایان شان نہ تھی۔ علمی اختلاف اپنی جگہ، لیکن خدمات کا اعتراف کیا جانا چاہیے۔ ویسے البانی صاحب کی زبان بھی اپنے ناقدوں کے لیے ویسی ہی شدید اور تند تھی چنانچہ وہ شیخ عبد الفتاح ابوغدہ اور ان کے استاد علامہ زاہد الکوثری کے لیے الظالم الجائر الجانی جیسے شدید الفاظ استعمال کرتے تھے۔ میرے والد علامہ شبیر احمد ازہر میرٹھیؒ نے بھی ائمہ رواۃ حدیث کے لیے سخت الفاظ لکھے ہیں جو مناسب نہ تھا۔

دار العلوم دیوبند میں کئی مسجدیں ہیں جن میں سب سے زیادہ خوبصورت اور وسیع مسجد رشید ہے جو ایک نئی مسجد ہے اور غالباً دہلی کی تاریخی جامع مسجد کے بعد ہندوستان کی سب سے بڑی اور خوبصورت مسجد ہے۔ اس کے علاوہ دار العلوم کی لائبریری کی بھی چھ منزلہ کشادہ عمارت بن رہی ہے۔ ہندوستان کے مدارس اسلامیہ اور اسلامی علمی مراکز میں دار العلوم کی لائبریری اپنی کثیر کتابوں اور اپنے علمی مخطوطات کے لیے مشہور ہے۔ البتہ طلبہ کی اقامت گاہیں ابھی بہت اچھی حالت میں نہیں ہیں۔ اس سلسلہ میں دار العلوم ندوۃ العلماء کی ہاسٹل سہولیات کہیں زیادہ بہتر ہیں۔

جامعہ امام انور شاہ میں: دیوبند کا تیسرا بڑا ادارہ جامعہ امام محمد انور ہے جسے علامہ انور شاہ کشمیری کی یاد میں ان کے فرزند اصغر مولانا انظر شاہ کشمیریؒ نے قائم کیا تھا۔ مولانا بڑے عالم ہونے کے ساتھ ساتھ عظیم خطیب اور البیلے نثر نگار بھی تھے۔ عصر حاضر کے تقاضوں سے آشنا اور میدان سیاست کے شہسوار بھی۔ چنانچہ آپ کانگریس کی یوپی شاخ کے صدر بھی رہے۔ مدارس اسلامیہ کے نصاب میں تبدیلی کو ضروری جانتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جامعہ امام انور میں نصاب تعلیم

میں خاصی انقلابی تبدیلیاں کی گئی ہیں۔ اس وقت مولانا انظر شاہ صاحب کے صاحبزادے مولانا احمد خضر شاہ مسعودی اس ادارہ کے سربراہ ہیں۔ ادارہ کے استاد مولانا وصی احمد قاسمی نے راقم کی کتاب ''عالم اسلام کے چند مشاہیر سوانح وافکار کا مطالعہ'' طلب کی تھی، چنانچہ بعد مغرب راقم نے مولانا صدر عالم کی ہمراہی میں جامعہ کی راہ لی۔ مولانا وصی احمد سے خاصی دیر مختلف امور پر تبادلۂ خیال رہا۔ پھر آپ نے جامعہ کے اہم شعبے دکھائے۔ اُنہی سے مولانا احمد خضر شاہ کا نمبر لیا اور ان سے فون پر بات ہوئی۔ مولانا نے دوسرے دن سات بجے ناشتہ پر بلایا۔ چنانچہ راقم سطور حاضر ہوا اور مولانا کے ساتھ ناشتہ کی میز پر مختصر سوال جواب کیے۔ آپ نے عربی میں تازہ بتازہ شائع ہوئی کتاب مختارات الامام الکشمیری تحفہ میں عنایت فرمائی۔

دارالعلوم وقف میں: مولانا احمد خضر شاہ صاحب سے ملاقات کے بعد طے شدہ پروگرام کے مطابق دارالعلوم وقف میں حاضری ہوئی۔ وہاں مہتمم دارالعلوم وقف مولانا سفیان القاسمی کے بیٹے جناب مولانا شکیب القاسمی سے ملاقات ہوئی جنہوں نے دارالعلوم دیوبند سے فضیلت کے بعد جامعہ از ہر مصر اور ملیشیا کی انٹرنیشنل یونیورسٹی سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی ہے۔ انہوں نے حجۃ الاسلام اکیڈمی سے عربی میں وحدۃ الامۃ کے نام سے ایک تحقیقی مجلّہ اور اردو میں ندائے دارالعلوم وقف (ماہنامہ) نکالنا شروع کیا ہے۔ شکیب صاحب مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے سینٹر برائے فروغ تعلیم وثقافت مسلمانانِ ہند (CEPECAMI) کی مسلم امت کا فکری بحران کانفرنس میں شرکت کر چکے ہیں۔ برج کورس کے سلسلہ میں راقم کے سوالوں کے جواب میں انہوں نے جو باتیں کہیں، ان کا خلاصہ یہ ہے: برج کورس سے کسی کو پریشانی نہیں۔ مولانا آزاد یونیورسٹی بھی برج کورس کئی سارے Streams میں لا رہی ہے۔ اہل مدارس کو اسے قبول کرنے میں کوئی تحفظ نہیں۔ ہمیں جو تحفظ ہے، وہ صرف ڈاکٹر شاز کی فکر سے ہے۔ ہم نے تو ان کی فکر کا براہ راست مطالعہ کرنا چاہا۔ سوالات مرتب کر کے ان کے پاس بھیجے، مگر انہوں نے کوئی Response نہیں دیا۔ انٹرفیتھ اور انٹرافیتھ کے ذریعہ مفاہمت پیدا ہو رہی ہے، وہ اچھی چیز ہے۔ یونیورسٹی میں تو یہ ہوتا ہی ہے۔ اس میں برج کورس کی کوئی تخصیص نہیں۔ سائنس کی مبادیات کو یوں متعارف کرایا جا سکتا ہے کہ اس کے لیے ایک ڈپلوما کورس مدارس میں اصل نصاب کو چھیڑے بغیر شروع کیا جائے۔ اور اس کا جو کورس بنایا جائے، اس میں ماہرین کے ساتھ علماء کو بھی شامل کیا جائے۔ بہر حال بڑے خوش گوار ماحول میں گفتگو ہوئی۔

اتحاد الطلبہ حیدرآباد میں: دارالعلوم میں اس وقت سال کے اخیر میں طلبائی انجمنوں کے پروگرام چل رہے تھے۔ دارالعلوم میں مختلف علاقوں شخصیات اور شہروں کے ناموں پر طلبائی انجمنیں ہیں۔ مولانا صدر عالم قاسمی کو حیدرآباد کے طلبہ نے اپنے پروگرام میں شرکت کی دعوت دی جسے انہوں نے قبول کر لیا۔ وہیں ان طلبہ سے میرا تعارف بحیثیت مترجم **لاتحزن** کے صدر عالم صاحب نے کرا دیا۔ پھر تو طلبہ مصر ہو گئے چنانچہ رات میں بعد عشا میں بھی ان کے ساتھ گیا۔ طلباء نے مختلف پروگراموں کے ساتھ ایک مکالمہ (ڈرامہ) بھی پیش کیا جس میں کرکٹ کے نقصانات کو دکھایا گیا تھا۔ ڈرامہ حیدرآباد کی اردو (مقامی بولی) میں تھا، اس لیے سامعین خوب محظوظ ہوئے۔ صدارت دارالعلوم کے صدر مفتی مولانا حبیب الرحمٰن خیرآبادی نے کی۔ اخیر میں مجھ سے بھی بحیثیت مترجم **لاتحزن** کے طلبہ کو خطاب کرنے کی دعوت

دی گئی۔ چنانچہ دس منٹ کی مختصر تقریر میں راقم نے تحریک دیوبند کی خدمات موجودہ دور کے چیلنجوں سے نمٹنے کے لیے ضروری صلاحیتوں کے حصول پر روشنی ڈالی۔علی الصباح دیوبند سے واپسی ہوگئی۔ دیوبند کے مختلف اداروں کے موجودہ نصابہائے تعلیم بھی میں نے جمع کر لیے تھے جن کے مطالعہ، اپنے مشاہدے اور علماء سے گفتگو کے بعد دو سوال ایسے ہیں جن کا جواب دیا جانا باقی ہے۔

ا۔مختلف امور میں دینی رہنمائی کے لیے ضروری ہے کہ زمانہ کا فہم بھی حاصل کیا جائے۔موجودہ سائنس، اس کی فکریات، موجودہ نظام معیشت اور نظام سیاست وغیرہ اس کا ذریعہ ہیں اور جن کو بغیر ضروری سیکولر علوم داخل کیے نہیں سمجھا جا سکتا تو آخر ہمارے مدارس کو ان کے سلسلہ میں شدید تحفظ کیوں ہے؟

۲۔درس نظامی کے ناقدین کہتے ہیں کہ ابتداء میں یہ دینی کم ،سیکولر زیادہ تھا۔خود دارالعلوم میں جو نصاب شروع میں اختیار کیا گیا، اس میں بھی سیکولر علوم (آلیہ) کا حصہ بہت زیادہ تھا مگر آج اس پہلے نصاب کی طرف مراجعت کی کوئی ضرورت کیوں محسوس نہیں کی جاتی حالانکہ خود متعدد دیوبندی اکابر مثلاً علامہ یوسف بنوری اور مولانا مناظر احسن گیلانی نے مروجہ درس نظامی پر سخت تنقیدیں کی ہیں؟

اہلِ علم وقلم کے لیے عظیم خوشخبری

اشاریہ ماہنامہ برہان دہلی

مرتب: محمد شاہد حنیف

mshanif2010@gmail.com،0333-4128743

اوراقِ پارینہ پبلشرز، لاہور 0321-4148570

کتاب سرائے، اُردو بازار، لاہور+فضلی سنز، اُردو بازار، کراچی

مولانا عتیق الرحمٰن عثمانیؒ اور مولانا سعید احمد اکبرآبادیؒ کے عظیم علمی، دینی، تحقیقی رسالے کے ۶۳ سالوں کے سیکڑوں شماروں میں برصغیر پاک و ہند کے علماءِ کرام، دانشوروں اور دیگر اہلِ علم وقلم کی قرآنیات، علومِ حدیث، فقہ واجتہاد، عبادات، معاشرت، سیاست، سیر وسوانح، شعر واَدب، تاریخ اسلام، تاریخ برصغیر پاک و ہند......وغیرہ کے علاوہ سیکڑوں موضوعات پر مشتمل ہزاروں مقالات وکتب سے آگاہی کے لیے موضوع وار اور مصنف وار اشاریہ......

محدود تعداد۔فوری رابطہ کریں۔ قیمت: ۸۰۰ روپے

ڈاکٹر محمد طفیل ہاشمی

میں کس کے ہاتھ پہ اپنا لہو تلاش کروں؟

مجھے نہ معلوم کیسے شروع سے یہ احساس تھا کہ پاکستان برصغیر میں اسلام کی بقا کے باعث وجود میں آیا۔ انگریزی انتداب کے بعد جس طبقے نے اسے سپین ہونے سے بچایا، حقیقتاً وہی لوگ اس ملک کے خالق ہیں اور اس کا نظم چلانے کے اولیں مستحق بھی۔ لیکن تاریخی ارتقا کے نتیجے میں ملکی نظم ونسق چلانے کے لیے کچھ مخصوص مہارتوں کی ضرورت ہوتی ہے جب کہ مدارس کا ایک طبقہ تقسیم ملک کے بعد بھی اس ذہنی کیفیت سے نہیں نکل سکا جو غیر ملکی تسلط کے باعث پیدا ہوئی تھی اور ایک حد تک فطری اور ناگزیر تھی۔ دوسرا طبقہ ''کنجے گرفت وترس خدارا بہانہ ساخت'' کا پیکر ہو گیا۔ ایسے میں ضرورت تھی کہ دینی طبقات کو ملکی نظام چلانے کی اہلیتوں کے حصول کے مواقع فراہم کیے جائیں۔

اتفاق سے میں علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی میں تھا اور اوپن یونیورسٹی اصلاً ان لوگوں کے لیے بنائی گئی تھی جو کسی بھی وجہ سے باقاعدہ کالجز/ یونیورسٹیز میں تعلیم حاصل نہیں کر سکتے تھے تاکہ اس یونیورسٹی کے ذریعے ان کے لیے تکمیلی تکنیکی فنی اور دیگر انواع کی تعلیم کا فاصلاتی طریق پر انتظام کیا جائے۔ میں نے سوچا کہ دینی مدارس کے طلبہ اپنی تعلیمی مصروفیات کے باعث رسمی تعلیم حاصل نہیں کر سکتے۔ دوسری طرف ہماری جامعات معمولی درجہ میں تفسیر، حدیث اور فقہ وغیرہ کی تعلیم دے کر ایم اے کی اسناد دیتی ہیں تو کیوں نہ یہ کیا جائے کہ دینی مدارس کے نصاب کو یونیورسٹی میں درجاتی کریڈٹ دیا جائے، مدارس کے اساتذہ کو یونیورسٹی ٹیوٹر مقرر کیا جائے اور دینی مدارس کے بعض متروک مضامین جو وقت کے تقاضوں کے مطابق ضروری ہیں، فاصلاتی طریقہ سے پڑھا دیے جائیں اور یونیورسٹی امتحان لے کر میٹرک سے پی ایچ ڈی تک ڈگری دیا کرے۔ مدارس کے نظم کو محفوظ رکھنے اور ان کا مالی تعاون کرنے کے لیے یہ بھی سوچا کہ طلبہ کے داخلے مدارس کے توسط سے کیے جائیں اور مدارس کے اساتذہ کو یونیورسٹی کا ٹیوٹر لگا کر ان کی آمدنی میں اضافے کی راہ نکالی جائے۔

یونیورسٹی اتھارٹیز اس پروگرام کے خلاف تھیں۔ ایسے میں مجھے باہر سے صرف مرحوم ڈاکٹر محمود غازی اور ڈاکٹر ایس ایم زمان کی مکمل حمایت حاصل تھی۔ آخر بہت مشکل سے اتھارٹیز کو رضامند کرنے کے بعد میں نے مختلف وفاقوں اور مدارس سے رابطے کرنا شروع کیے۔ مجھے بریلوی، اہل حدیث اور شیعہ وفاقوں کی طرف سے بھرپور یقین دہانی کرائی گئی، لیکن دیوبندی وفاق کو اس کی افادیت باور کروانے میں مجھے بہت وقت محنت اور وسائل خرچ کرنا پڑے۔ ایک

سے زائد مرتبہ وفاق کے اجلاسوں میں بھی پروگرام پیش کیا۔ کراچی جا کر مولانا سلیم اللہ خان سے بھی ملاقات کی اور باقاعدہ ایک معاہدہ طے ہوا۔ اس کے مطابق مجھے آٹھ نو ماہ کے بعد یہ پروگرام لانچ کر دینا تھا، لیکن ایک دن اچانک میرے آفس میں وفاق المدارس کے ایک نمائندہ وفد کے ارکان یکے بعد دیگرے آنا شروع ہو گئے۔ جب سب تشریف لا چکے تو میرے پوچھنے پر انہوں نے کہا کہ ہم اس لیے آئے ہیں کہ جو پروگرام ہمارے درمیان طے ہوا، اس پر فوراً اور اسی سمسٹر سے عمل درآمد کیا جائے۔ میں نے اپنی مشکلات اور یونیورسٹی کا طریق کار سب کچھ عرض کیا، لیکن وفد میں موجود استاذ گرامی قدر مولانا نذیر احمد صاحب کی وجہ سے میں نے ہامی بھر لی اور قہر درویش بر جان خویش کے مصداق دن رات کام کر کے پروگرام شروع کر دیا۔ جب میرے پاس داخلوں کی تفصیل آئی تو معلوم ہوا کہ دیوبندی وفاق سے کوئی طالب علم داخل نہیں ہوا۔

مرے تھے جن کے لیے.....

حیرت ہوئی۔ مولانا محمد زاہد سے معلوم کیا تو انہوں نے صرف یہ کہا کہ علماء کرام نے رجوع کر لیا۔ بعد میں دیگر ذرائع سے معلوم ہوا کہ مولانا سلیم اللہ خان نے تمام مدارس کو ایک سرکلر جاری کر دیا تھا کہ طفیل ہاشمی کا پروگرام مدارس کے خلاف حکومت کی سازش ہے، اس میں کوئی طالب علم داخل نہ کروایا جائے۔ اگرچہ میرے پاس ثبوت کوئی نہیں، لیکن مجھے لگتا ہے کہ یونیورسٹی کی جس میٹنگ میں یہ پروگرام منظور کیا گیا، اس وقت کے وفاقی سکریٹری ایجوکیشن بھی اس کے ممبر تھے۔ میٹنگ کے بعد انہوں نے تنہائی میں مجھے کہا، یہ کیا کرنے جا رہے ہیں؟ مدرسوں کے مولوی اگر ڈگری لے کر سی ایس ایس کر کے بیوروکریسی میں آ جائیں گے تو ہمارے بچے کہاں جائیں گے؟ میں نے انہیں جواب دیا کہ کہاں سی ایس ایس، بیچارے تعلیمی اداروں میں چلے جائیں تو بھی بسا غنیمت، لیکن وہ بہت منجھے ہوئے اور سینئر بیوروکریٹ تھے اور مستقبل کو دور تک دیکھ سکتے تھے۔ مجھے شبہ ہوتا ہے کہ مولانا سلیم اللہ خان تک سازش تھیوری انہوں نے نہ پہنچائی ہو اور دیوبندی علماء سازش کے خوف کا بآسانی شکار ہو جاتے ہیں۔

اس حادثے کے نتیجے میں مختلف اہل علم اور اہل اللہ کے تقویٰ، دانش، کردار کی بلندی اور بے شمار خوبیوں سے متعارف ہو کر ایک نظریہ نہ بنانا میرے بس میں نہیں تھا۔

محمد سلیمان کھوکھر ایڈووکیٹ

لاہور کے سیاست کدے

لاہور کے بادامی باغ سے اگر آپ ریلوے اسٹیشن کی طرف جائیں تو دائیں جانب پہلے مستی گیٹ اور اس سے آگے شیرانوالہ گیٹ نظر آئے گا۔ اب تو ہجوم آبادی کے سبب لاہور کے سب تاریخی دروازوں کی طرح اس کا بھی حسن گہنا گیا ہے۔ دروازے کے اندر داخل ہوں تو دائیں جانب وہ تاریخی مسجد شیرانوالہ گیٹ ہے جہاں پاکستان کی سیاست کے کئی اسرار ورموز دفن ہیں۔ یہ مسجد ایوب خاں اور ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف چلائی جانے والی بڑی بڑی تحریکوں کا مرکز رہی ہے۔ تحریک ریشمی رومال کے بانی مولانا عبیداللہ سندھی کے جانشین مولانا احمد علی لاہوری نے ایک عرصہ تک یہاں اللہ اور اللہ کے رسول کا پیغام لوگوں تک پہنچایا۔ انہیں حقوق انسانی کی پاسداری کا سبق دیا اور فرنگی سامراج کے خلاف طویل عرصہ تک صبر آزما جدوجہد کی۔ پھر قیام پاکستان کے بعد حضرت لاہوری جب ملک عدم کے راہی ہو گئے تو فرنگی سامراج کی جگہ "دیسی سامراج" لے چکا تھا اور صرف گیارہ سال بعد ملک پر مارشل لاء کے سیاہ بادل چھا گئے اور جرنیلوں کی طویل رات کا آغاز ہوا۔

ایوب خاں کے مارشل لاء کے دوران سیاسی راہنماؤں اور کارکنوں کو جدوجہد کے لیے لاہور میں جو ٹھکانے دستیاب تھے، جامع مسجد شیرانوالہ گیٹ کا ان میں بڑا مقام تھا۔ مولانا عبیداللہ انور یہیں ہر جمعرات کو نماز مغرب کے بعد مجلس ذکر کا اہتمام کرتے جہاں دور دراز سے ان کے عقیدت مند شامل ہوتے۔ ایوب خاں کے خلاف لاہور میں سب سے پہلا اور بڑا جلوس اسی جامع مسجد سے نکالا گیا جس میں پیپلز پارٹی کے شیخ رشید مرحوم کے علاوہ نیشنل عوامی پارٹی کے میاں محمود علی قصوری اور شیخ رفیق نے بھی شرکت کی۔ میاں صاحب اور شیخ رفیق بعد میں پاکستان پیپلز پارٹی میں شامل ہو گئے۔ میاں صاحب وفاقی وزیر قانون اور شیخ رفیق پنجاب اسمبلی کے سپیکر اور گورنر رہے۔ مولانا سمیت سب اسی جلوس سے گرفتار ہوئے۔ بعد میں انہیں کوٹ لکھپت جیل میں رکھا گیا۔ میری خوش قسمتی تھی کہ بہت چھوٹی عمر میں ہی ان ہستیوں کے ساتھ گرفتار ہوا اور کوٹ لکھپت جیل میں قید رہا۔

ایوب خاں رخصت ہوا تو ایک اور جنرل، یحییٰ خاں سامنے کھڑا تھا، اپنا پورا جلال ودبدبہ اور قد وقامت لیے ہوئے۔ یحییٰ خاں نے ۱۹۷۰ء کے عام انتخابات کا اعلان کیا تو مشرقی ومغربی پاکستان کے سیاسی حلقوں میں ایک لہر دوڑ گئی۔ ہر سیاسی جماعت نے لنگر لنگوٹ کس کے اپنی اپنی سرگرمیاں شروع کر دیں۔ مشرقی پاکستان میں بلاشرکت غیرے شیخ مجیب الرحمان کی جماعت عوامی لیگ اپنے انتخابی نشان "کشتی" کو لیے نمایاں تھی۔ دیگر جماعتوں میں وہاں

جماعت اسلامی کی پوزیشن اگرچہ بہتر تھی مگر فرق انیس بیس کا نہیں، دو اٹھارہ کا تھا۔ جماعت کا خیال تھا کہ مشرقی پاکستان سے انہیں بہت نشستیں ملیں گی اور اگر مغربی پاکستان سے انہیں چند سیٹیں مل جائیں تو وہ حکومت بنا سکتی ہے۔ جماعت نے تو وزیر اعظم میاں طفیل سمیت تمام کابینہ بھی مکمل کر لی تھی۔ عوام نے مگر انہیں رد کر دیا اور مغربی پاکستان سے انہیں چار نشستیں ملیں جبکہ مشرقی پاکستان سے مکمل صفایا ہو گیا جس کا انتقام جماعت اسلامی نے مشرقی پاکستان کے بنگالیوں سے بڑا بھیانک لیا۔ پاکستان پیپلز پارٹی نے مشرقی پاکستان سے کوئی بھی امیدوار میدان میں کھڑا نہیں کیا تھا۔ البتہ عوامی لیگ نے لاہور سے ملک حامد سرفراز کو انتخابی میدان میں اتارا۔

مغربی پاکستان میں پیپلز پارٹی کا طوطی بول رہا تھا اور ذوالفقار علی بھٹو ایک پارہ صفت قیادت کے طور پر ابھرے۔ "تلوار" کا انتخابی نشان لیے وہ پنجاب اور سندھ میں چھا گئے۔ مغربی پاکستان کی دیگر قابل ذکر جماعتوں میں نیشنل عوامی پارٹی اور جمعیۃ علماء اسلام نے صوبہ سرحد اور بلوچستان میں اپنی صوبائی حکومتیں قائم کر لیں۔ مفتی محمود صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ اور ارباب سکندر خاں خلیل گورنر بنے، جبکہ سردار عطاء اللہ مینگل بلوچستان کے وزیر اعلیٰ اور میر غوث بخش بزنجو گورنر بنے۔ کراچی سے جماعت اسلامی کے پروفیسر غفور احمد اور محمود اعظم فاروقی بھی قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے جبکہ شاہ احمد نورانی کی جماعت "جمعیۃ علماء پاکستان" نے کراچی سمیت ملک بھر سے قومی اسمبلی کی سات نشستیں حاصل کیں۔ نورانی میاں پہلی بار ایک جماعت بنا کر میدان سیاست میں آئے تھے اور آتے ہی سات نشستیں حاصل کر لیں۔

مسجد شیرانوالہ گیٹ، شہر لاہور میں پہلے ایوب خان کی آمریت کی خلاف ایک مضبوط قلعہ ثابت ہوئی اور ۱۹۷۰ء کے عام انتخابات میں بھی یہ لاہور کے اہم سیاست کدوں میں شمار ہوتی تھی۔ ڈاکٹر مبشر حسن، شیخ رشید، حنیف رامے، حبیب جالب اور احسان وائیں اکثر و بیشتر مولانا عبید اللہ انور سے ملنے آتے۔ اسی دوران موچی دروازہ میں جمعیۃ علماء اسلام کے ایک جلسہ عام میں مولانا عبید اللہ انور نے کہا کہ پاکستان پیپلز پارٹی کے کارکنان اور اُس کی قیادت سے سیاسی اختلاف تو ہو سکتا ہے، مگر انہیں کافر نہیں کہا جا سکتا۔ ان انتخابات میں جماعت اسلامی کا سب سے بڑا نشانہ ذوالفقار علی بھٹو اور پیپلز پارٹی کے کارکنان تھے۔ جمعیۃ علماء اسلام کو بھی جماعت اسلامی نے نشانے پر رکھ لیا اور خوب گولہ باری کی۔ بس ایک "کافر" کے علاوہ وہ کون کون سے الزمات تھے جو جماعت نے ان پر نہ تھوپے۔ مغربی پاکستان میں ذوالفقار علی بھٹو تو اپنی مقبولیت کی معراج پر تھے۔ لاڑکانہ لاہور اور دیگر علاقوں سے انتخاب لڑنے کا اعلان کرتے کرتے پتہ نہیں ان کے من کی موج کس طرف نکل گئی کہ ڈیرہ اسماعیل خاں سے مفتی محمود کے خلاف بھی کاغذات نامزدگی داخل کرا دیے۔

مسجد شیرانوالہ گیٹ کے سینے میں کئی راز دفن ہیں۔ ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ پاکستان پیپلز پارٹی اور جمعیۃ علماء اسلام کے درمیان انتخابی اتحاد کی گفت وشنید ہو رہی تھی تو بقول مولانا عبید اللہ انور کے صاحبزادے، جناب اجمل قادری کے، مفتی محمود اپنا مقدمہ لے کر جامع مسجد شیرانوالہ گیٹ لاہور آئے اور پیپلز پارٹی کے ساتھ جمعیۃ علماء اسلام کا ہونے والا ممکنہ انتخابی اتحاد خواب خیال ہو گیا۔ اب بھی شیرانوالہ گیٹ لاہور میں یہ مسجد موجود ہے، مگر نہ مولانا احمد علی لاہوری رہے نہ مولانا عبید اللہ انور۔ گویا اولیاء کا سایہ اُٹھ گیا۔ رہے مفتی محمود، شیخ رشید، حنیف رامے اور حبیب جالب تو وہ ایسے چاند تھے جو چمک چمک کے پلٹ گئے۔ بس اجمل قادری صاحب، ڈاکٹر مبشر حسن اور احسان وائیں باقی ہیں۔ اللہ تعالیٰ اُن کی عمر دراز کرے کہ قوم کو ابھی ان کی ضرورت ہے۔